شیخ محمود احمد

اسلام کا نظریۂ سود اور بنک کاری

سود کے مسئلے کا اصل تعلق ان آیات قرآن سے ہے جن میں ربٰو حرام قرار دیا گیا ہے، مگر ان آیات کو غور سے دیکھ لیا جائے تو بہت سی دقتیں جو اس سلسلے میں پیدا کی جارہی ہیں خود بخود دور ہو جاتی ہیں۔ میں صرف ایک آیت کی طرف آپ کی توجہ خصوصیت سے مبذول کراؤں گا۔ ارشاد ہوتا ہے

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ط ذَالِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۔

جو لوگ ربٰو کھاتے ہیں وہ اس طرح اٹھیں گے جیسے کسی کو انسان نے لپٹ کر مخبوط بنا دیا ہو۔ یہ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ بیع بھی ایک قسم کا ربٰو ہے۔ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربٰو کو حرام قرار دیا ہے۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس آیت کی مخاطب جو قوم تھی وہ سود کا تجارت سے تعلق واضح طور پر سمجھتی تھی اور کہتی تھی کہ تجارت بھی تو ایک طرح کا ربٰو ہی ہے لیکن ان کی دلیل کو سننے کے بعد بھی اللہ تعالےٰ اصرار فرماتے ہیں کہ تجارت جائز ہے اور سود حرام۔

یہ مسئلہ آج بھی کم و بیش اسی شکل میں ہمارے سامنے ہے جس شکل میں یہ مکہ کی تجارت پیشہ قوم کے سامنے تھا۔ جنہیں تجارتی ضروریات روپیہ کے لین دین پر مجبور کرتی تھیں۔ صرف ہماری دقتیں آج کل کی بنک کاری کی سہولتوں اور آسانیوں کے پیش نظر اور بھی بڑھ گئی ہیں اور ہم بھی اکثر دل سے وہی کہنا چاہتے ہیں جو عرب کے تاجروں نے کہا تھا کہ بیع بھی ایک قسم کا ربٰو ہی ہے۔

قرآن نے اس پر اصرار تو کیا ہے کہ تجارت جائز ہے اور سود حرام ہے مگر ان میں فرق نہیں سمجھایا کہ تجارت کس وجہ سے جائز ہے اور سود کیوں ناجائز ہے۔ شاید یہ کرنا قرآن کا کام بھی نہیں تھا معاشی گتھیاں سلجھانا قرآن کا کام نہیں ہے بلکہ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم دیکھیں کہ وہ کونسی حکمت تھی جو اس حکم میں کارفرما ہے۔

تجارت اور سود میں بنیادی فرق یہ ہے کہ تجارت میں محنت کی جاتی ہے۔ مال سستی جگہ سے

خریدا جاتا ہے۔ مہنگی جگہ میں بیچا جاتا ہے۔ اور اگرچہ تاجر یہ کام اپنی منفعت کے لیے کرتا ہے لیکن وہ ایسا کرنے میں ایک اہم معاشی خدمت بھی انجام دیتا ہے اور وہ یہ کہ مال کی جہاں افراط ہوتی ہے وہاں سے تاجر اٹھاکر اسے اس جگہ لے جاتا ہے جہاں مال کی قلت ہو۔ ایسا کرنے میں وہ کچھ منافع کماتا ہے جسے قرآن مجید حلال قرار دیتا ہے۔

سود اس کے برعکس کسی کام اور محنت سے متعلق نہیں ہے بلکہ راس المال پر بڑھوتی کا نام ہے یہ تاجر کی محنت میں سے حصہ لینے کا نام ہے اور حصہ بھی پہلے سے معین کردہ۔ یہ پہلے سے معین حصہ اس لیے اسلام کو منظور نہیں کہ اس میں ظلم کا احتمال ہے۔ ممکن ہے تاجر اتنا نہ کمائے جتنا سرمایہ دار نے اس سے لینا پہلے سے طے کر لیا ہو۔ اس لیے اسلام اسے حرام قرار دیتا ہے۔ آدمی کی محنت کو سرمایہ کا حصہ پہلے سے معین کر لینے سے ثانوی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور اسلام سرمایہ کو ثانوی حیثیت دینا چاہتا ہے آدمی کی محنت کو نہیں۔

اگر تجارت اور سود کا یہ فرق سمجھنے کے باوجود ہم سود پر اصرار کریں تو ہمیں قرآن مجید کی ایک اور آیت بھی پڑھ لینی چاہیئے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا۔ فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ○ (البقرہ ۲۷۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور تمہارا جو سود باقی ہے اسے چھوڑ دو اگر تم واقعی مومن ہو۔ اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ اور اگر تم توبہ کر لو تو تم اپنے راس المال لے سکتے ہو۔ ہم چاہتے ہیں کہ نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم ہو۔

اس مسئلے کی نزاکت اور اہمیت اسی آیت میں بڑی وضاحت سے بیان ہوئی ہے اور ربٰو کی تعریف بھی اخذ کی جا سکتی ہے۔ ربٰو وہ ہے جو راس المال پر زیادتی ہو، بغیر محنت کے اور بغیر خطرہ کے قابل غور چیز یہ ہے راس المال پر یہ زیادتی جسے سود کہتے ہیں اسلام کے نزدیک کوئی اس قسم کی غیر معمولی حرام چیز ہے جس کا باقی حرام چیزوں مثلاً شراب، زنا اور جوا سے درجہ بہت مختلف ہے۔ کسی جرم کی سزا اتنی خوفناک نہیں ہے جتنی کہ سود کھانے کی کیونکہ یہ اللہ کے ساتھ اعلانِ جنگ کے مترادف ہے۔

اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے میری مودبانہ گذارش یہ ہے کہ مسئلے کے اس نازک پہلو کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ ہماری عملی دقتوں اور مجبوریوں کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو ہمیں عمداً قرآن کے معانی اور مفہوم

بدلنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ ممکن ہے کہ ہم وقت کے ساتھ اپنی وقتوں اور مجبوریوں کے ایسے علاج تجویز کر سکیں جن سے نہ صرف سب وقتیں دور ہو جائیں بلکہ قرآن مجید کے احکام کی تحریف بھی نہ ہو۔

کچھ عرصہ ہوا کہ ہمارے ایک محترم بزرگ سید یعقوب شاہ صاحب نے یہ اعتراض کیا تھا کہ جس قوم کے لیے حرمت سود کی آیات نازل ہوئی تھیں اس میں تجارتی مقاصد کے لیے لین دین نہیں ہوتا تھا بلکہ صرف صرفی ضروریات کے لیے لین دین ہوتا تھا۔ اس لیے یہ سمجھنا پڑے گا کہ سود صرف ان صورتوں میں حرام ہے جہاں صرفی ضروریات کے لیے روپیہ قرض دیا جائے۔ یہ دلیل اس لحاظ سے حیرت انگیز ہے کہ گذشتہ تیرہ سو سال سے فقہاء کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ قرضے خواہ صرفی نوعیت کے ہوں یا تعمیری نوعیت کے سود سب پر حرام ہے۔ اب اگر قبلہ شاہ صاحب اس نقطۂ نظر کو بدلنا چاہتے ہیں تو انہیں یہ ثابت کرنا چاہیے کہ واقعی نزول قرآن کے وقت تجارتی لین دین کے لیے قرضے نہیں لیے جاتے تھے۔ بجائے اس کے ان کا اصرار ہے کہ ہم ثابت کریں کہ ایسے قرضے لیے جاتے تھے۔ میں نے ایک مختصر ملاقات میں ان کی توجہ شافٹ کے اس مضمون کی طرف دلائی تھی جو ربٰو کے عنوان سے انہوں نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں "معین مدت اور شرح سود کے ساتھ لین دین اور ہر قسم کا سٹہ مکہ کے ترقی یافتہ تجارتی مرکز میں موجود تھا۔" لیکن شافٹ نے چونکہ یہ لیمنز کے حوالے سے لکھا ہے اور شاہ صاحب کے نزدیک لیمنز جھوٹا ہے اس لیے انہیں یہ قبول نہ تھا۔ معلوم نہیں شاہ صاحب شافٹ کو سچا مانتے ہیں یا نہیں کیونکہ جب تک شافٹ کو بھی جھوٹا نہ سمجھا جائے یہ بیان غلط نہیں بنتا۔ کیونکہ شافٹ نے لیمنز کے اس بیان کو اپنا بنا لیا ہے۔ قبلہ شاہ صاحب کے اس اعتراض کے جواب میں علی گڑھ کے ایک ماہنامہ اسلامک تھوٹ میں ایک مضمون قریباً سوا سال پہلے چھپا تھا اس میں فاضل مضمون نگار نے بیسیوں سندیں اس چیز کی مہیا کی تھیں کہ رسول کریمؐ کے زمانے میں تعمیری مقاصد کے لیے لین دین ہوتا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس اس وقت اس مضمون کے حوالے موجود نہیں ہیں اور یہ میں کسی دوسرے موقع پر پیش کر سکوں گا۔

حدیث میں جن قرضوں پر سود منع کیا گیا ہے ان میں بوضاحت سونے اور چاندی کے قرضے شامل ہیں۔ انہیں احادیث میں بعض اشیائے خورد و نوش کا ذکر بھی ہے۔ مثلاً گندم، جو، خرمے، اور نمک یہ آخری چیزیں تو صرفی نوعیت کی ہیں لیکن سونے اور چاندی کے قرضے لامحالہ تعمیری مقاصد کے لیے ہی

دیے جاتے ہوں گے۔ جیسا کہ آپ سب حضرات کو معلوم ہے قرون وسطیٰ میں سونا اور چاندی یا ان کے بنے ہوئے سکے وہی کام سرانجام دیتے تھے جو آج نوٹ یا چیک سرانجام دیتے ہیں۔ عرب میں دینار اور درہم تھے جو علی الترتیب سونے اور چاندی کے سکے تھے۔ اور جن کی قیمت ان کی دھات کی قیمت کے برابر تھی۔ اگر کوئی شخص تجارتی ضروریات سے کسی سے قرض لیتا ہوگا تو وہ انہیں سونے اور چاندی کے سکوں کا قرض حاصل کرتا ہوگا، اور انہیں کے متعلق حدیث کا یہ ارشاد ہے کہ ان کا لین دین بالکل برابر ہونا چاہیئے اور جو زیادہ دے گا یا لے گا وہ سود ہے۔

قرآن کی عبارت اور حدیث کی عبارت دونوں اس چیز کو واضح کرتی ہیں کہ صرفی اور تعمیری مقاصد میں فرق نہ قرآن روا رکھتا ہے اور نہ حدیث۔ اب شاید اس مسئلے میں زیادہ وضاحت کی اس لیے بھی ضرورت نہیں رہی کہ قبلہ شاہ صاحب کی ایک چٹھی گذشتہ دنوں پاکستان ٹائمز میں چھپی تھی جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ انہیں اعتراف ہے کہ زرعی مقاصد کے لیے عرب میں لین دین ہوتا تھا۔ اگر وہ اتنا تسلیم کرتے ہیں تو پھر ہماری ساری دلیل انہیں قابل قبول سمجھنی چاہیے کیونکہ فنی اور علمی نقطہ نظر سے زرعی قرضے اور تجارتی قرضے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر زرعی قرضے پر اسلام میں سود منع ہے تو پھر تجارتی اور صنعتی قرضے پر بھی منع ہوگا۔ اور اگر زرعی قرضے پر سود جائز ہے تو پھر تجارتی اور صنعتی قرضے پر بھی جائز ہوگا۔ لہٰذا ان کی یہ دلیل کہ تعمیری مقاصد کے لیے اس زمانے میں قرض لیا دیا ہی نہیں جاتا تھا خود ان کے اعتراف سے باطل ہو جاتی ہے۔

اگر یہ چیز تسلیم کر لی جائے کہ اسلام واقعی سود کو حرام ٹھہراتا ہے تو پھر ہم ایک قدم آگے چل سکتے ہیں۔ اور یہ سوچ سکتے ہیں کہ کیا اس حکم سے پیدا کردہ ہماری مجبوریاں اتنی شدید ہیں کہ ہم قرآن کو پس پشت ڈال دیں یا ان میں کوئی گنجائش ایسی نظر آتی ہے کہ وہ غور و فکر سے دور کی جا سکیں۔

سب سے پہلا سوال جو اس سلسلہ میں پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ سرمایہ پر سود کی ادائگی کا جواز کیا ہے؟ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لیے ہمیں معاشیات کے ماہروں کے پاس جانا پڑتا ہے اور وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ سود اس لیے ادا کرنا چاہیئے کہ وہ ترک صرف کی قیمت ہے۔ یعنی ایک شخص جس کے پاس دس ہزار روپیہ موجود ہے وہ بجائے اس کے کہ اس سے ایک موٹر کار خرید لے اسے کسی کاروبار میں لگا دیتا ہے اور چونکہ اس نے اپنے روپے کو صرف کرنے کے حق کو استعمال نہیں کیا اس لیے اسے اس حق کو نہ استعمال کرنے کی قیمت سود کی شکل میں ملنی چاہیے۔ اس نظریہ سود پر

سوشلسٹ مصنف لاسیل نے بڑی پیاری پھبتی کسی تھی۔ اس نے کہا ہے کہ یہ بڑے بڑے سرمایہ دار واقعی بڑے تارک الدنیا لوگ ہیں اور سب سے بڑا تارک الدنیا بیرن راتھ چائلڈ ہے۔ اس قسم کے اعتراضوں کے زیر اثر الفاظ میں ترمیم کی گئی اور کہا گیا کہ سود دراصل انتظار کی قیمت ہے۔ گویا گلاب کا نام بدلنے سے اس کی خوشبو میں اضافہ کی کوشش کی گئی۔ اس نئے نظریہ کا مفہوم یہ ہے کہ چونکہ قرض دینے والا اپنے روپے کی واپسی کا انتظار کھینچتا ہے۔ لہٰذا اس انتظار کی قیمت اسے سود کی شکل میں ادا ہونی چاہیے۔ یہاں اخلاقی نقطۂ نظر سے جو اعتراض پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ انتظار اپنی ذات میں کوئی تعمیری چیز نہیں ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ ایک تعمیری کام کا امکان ہے۔ جس روپے کا انتظار کیا جا رہا ہے وہ تعمیری مقاصد پر بھی صرف ہو سکتا ہے اور حرفی مقاصد پر بھی۔ انتظار کی قیمت کا تعین اخلاقی نقطۂ نظر سے اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب یہ پتہ چلے کہ جس روپے کا انتظار ہو رہا ہے اس کی تعمیری کارکردگی کیا ہے۔ کیونکہ جب تک تعمیری کارکردگی کا پتہ نہ چلے انتظار کی قیمت معین نہیں ہو سکتی۔ انتظار کی قیمت کو تعمیری کارکردگی کا صرف ایک جز مل سکے گا اور جب تک کل معین نہ ہو جز کا کیسے پتہ چل سکتا ہے۔

جب معاشیات کو اس اعتراض کا جواب نہیں ملتا تو وہ اس نظریہ کو ترک کر کے ایک اور نظریہ اپنا لیتی ہے اور اسے سود کے تعمیری نظریہ کا نام دیتی ہے۔ اس نظریے کے مطابق سود اس لیے ضروری ہے کہ سرمایہ ایک تعمیری کام کرتا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ سرمایہ اپنا حق خدمت وصول نہ کرے۔ یہاں پہنچ کر پھر وہی دقت پیدا ہو جاتی ہے کہ جب تک سرمایہ کی کارکردگی کا علم نہ ہو اس کا حق خدمت پہلے سے کیسے معین کر دیا جائے۔ سرمایہ کی کارکردگی ایک انتہائی متبدل چیز ہے اور سود ایک معین شرح کا نام ہے۔ جب تک سرمایہ کے حق خدمت کو خود سرمایہ کی کارکردگی کی طرح ایک متبدل چیز نہ بنایا جائے اس وقت تک نہ منطق اس نظریہ سود کو قبول کرے گی، نہ اخلاقیات اور نہ اسلام۔

اسلام کو اس چیز سے کوئی اختلاف نہیں ہے کہ سرمایہ واقعی ایک رکن پیدائش ہے اور تعمیری کاموں میں اہم خدمات سرانجام دیتا ہے۔ اسلام کا اس سے بھی اتفاق ہے کہ سرمائے کو اس کا حق خدمت ملنا چاہیے۔ ظاہر ہے حق خدمت کا تعین عمل خدمت کے اختتام پر ہی ہو سکتا ہے۔ سو یہاں اختلاف صرف اتنا رہ گیا ہے کہ سرمائے کی قیمت اس کے استعمال سے پہلے معین ہو یا اس کے بعد۔ معاشیات اس کا تعین پہلے سے کرتی ہے اور ایسا کرنے کی کوئی معقول وجہ پیش نہیں کرتی اور اسلام سرمائے کا حق خدمت

عمل پیدائش کے بعد معین کرنا چاہتا ہے۔ اس اختلاف کے پس پردہ بنیادی نقطۂ نظر کا اختلاف بھی ہے۔ اسلام انسانی محنت کے صلہ کو سرمایہ کے حق خدمت کی ادائگی پر فوقیت دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ سرمائے کا حق خدمت پہلے سے معین نہیں کرنا چاہتا۔ معاشیات سرمائے پر محنت کا تفوق تسلیم نہیں کرتی بلکہ مسئلہ سود کے تحت تو یوں نظر آتا ہے کہ الٹا محنت پر سرمایہ کا تفوق تسلیم کر رہی ہے۔

ایک معاشی تصور بڑا عرصہ یہ بھی رہا ہے کہ اگر روپے کو اس کا حق خدمت نہ ملے یا اس کا حق خدمت ایک خاص حد سے گر جائے تو مزید سرمایہ پیدا ہونا بند ہو جائے گا۔ یہ نقطۂ نظر خود گذشتہ پچاس سال کے تجربہ نے غلط ثابت کر دیا ہے۔ جب یہ صدی شروع ہوئی تو اس وقت عام شرح سود آج کی شرح سود سے کم و بیش دوگنا یا اس سے زیادہ تھی۔ لیکن اس وقت جو سرمایہ موجود تھا آج اس سے دس گنا زیادہ سرمایہ بنکوں اور کمپنیوں کے پاس موجود ہے۔ لہذا باوجود اس کے کہ شرح سود مسلسل گھٹتی گئی ہے تجارتی سرمائے میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اور علمی نقطۂ نظر سے کوئی معقول وجہ ایسی نظر نہیں آتی کہ باوجود شرح سود میں مزید کمی کے سرمائے کی مزید مقدار میں ترقی نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اوسط آدمی کوئی رقم پس انداز کرتے وقت شرح سود کو بالکل نہیں دیکھتا۔ بلکہ اگر وہ اپنے بڑھاپے، بیماری یا بچوں کی ضروریات کے پیش نظر بچا سکتا ہے تو وہ ضرور رقمیں بچاتا رہے گا۔ اسی طرح تجارتی ادارے ہمیشہ اپنی آمدنی میں سے کچھ رقم ریزرو فنڈ کے طور پر ہر سال بچا لیتے ہیں اور سود کی شرح کچھ بھی کیوں نہ ہو ان کے تجارتی استحکام کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اپنے ریزرو فنڈ سال بہ سال بڑھاتے رہیں۔

اس صدی میں کئی ایسے معاشیات کے ماہرین ہو گزرے ہیں جنھوں نے سود کے تصور سے متعلق معاشیات کے نقطۂ نظر کی شدید مخالفت کی ہے۔ غالباً اس صدی کا سب سے بڑا مالیات اور معاشیات کا ماہر کینز تھا۔ اس کا نقطۂ نظر خود اس کے الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔

"اسی قسم کا ایک نمایاں مسئلہ ایسا ہے جس پر صدیوں بلکہ ہزاروں سال علمی رائے ایک نظریہ کو واضح سمجھتی تھی۔ جسے کلاسیکل سکول نے بچپنے کا نظریہ کہہ کر ترک کر دیا۔ لیکن جسے دوبارہ قبول کرنے اور احترام کرنے کی ضرورت ہے۔ میرا مطلب اس نظریہ سے ہے کہ سود کی شرح خود بخود کسی ایسی سطح کو اختیار نہیں کرتی جو سوسائٹی کے لیے مفید اور ممد ہو بلکہ اس سے اونچا جانے کا رجحان رکھتی ہے اور ایک

ہوشمند حکومت کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ قانون اور رواج اور اخلاقی قانون کے احکام کی مدد حاصل کرے اور سود کو دبائے۔" (کینز۔ جنرل تھیوری آف امپلائمنٹ، انٹرسٹ اینڈ منی، ص ۳)

کینز اپنی اسی کتاب میں کلیہ کے طور پر اپنی یہ رائے پیش کرتا ہے کہ "سود سرمائے کی کارکردگی کو محدود کر دیتا ہے۔" وہ لوگ بھی جو کینز کے نقطۂ ہائے نظر سے اختلاف کرتے ہیں اس کی بصیرت کے معترف ہیں۔ اور مسائل کو نئے سرے سے سوچنے پر مجبور ہیں۔ معاشیات کے فکر و نظر میں ایک انقلاب آ رہا ہے جسے کینزین ریوولوشن یا کینز کا انقلاب کہتے ہیں۔ چنانچہ کینز کے نظریات پر مغربی دنیا میں بڑا کام کیا جا رہا ہے اور اگرچہ وہ کام وہاں تک تو نہیں پہنچا جسے ہم اسلامی نقطۂ نظر کہہ سکیں۔ لیکن اس کی سمت یہی معلوم ہوتی ہے۔

عین اس وقت جب کہ خود معاشیین کے سربراہ سود کاری کو شبہ کی نظر سے دیکھنا شروع کر رہے ہوں اور اس صدی کا سب سے بڑا مالیات کا ماہر مذہب سے مدد حاصل کر کے سود کو دبانا چاہتا ہو، یہ بہت بڑا المیہ ہوگا کہ امت وسطیٰ کے بعض صاحب فکر سود کاری کو حلال بتائیں۔ اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ عین اس وقت اعلان جنگ کریں جب مغرب صلح کرنے کی سبیل سوچ رہا ہو۔ حالانکہ اس نے اعلان جنگ والی آیت بھی نہیں پڑھی ہوگی۔

اب صرف یہ سوال باقی رہتا ہے کہ کیا سود کے بغیر دنیا کا تجارتی کاروبار ممکن ہے یا نہیں۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سود کاری کا نظام کسی ایک شخص نے تجویز نہیں کیا تھا بلکہ صدیوں کا تجربہ اور سینکڑوں لوگوں کی کاوش اس میں شریک تھی۔ اب اگر اس بنک کاری کی اساس کو بدلنا مقصود ہو تو کوئی ایک شخص اس کی مکمل تشکیل نہیں کر سکے گا۔ مکمل جواب سالہا سال کی بہت سے آدمیوں کی تحقیق اور محنت ہی دے سکتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اسلام کا معاشرتی اور معاشی نظام اس وقت تک نہ قابل فہم ہے اور نہ قابل عمل جب تک قوم مجموعی طور پر اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ میں اس سلسلے میں چند گزارشات کروں گا جو فکر کو شاید کچھ تحریک دے سکیں۔

موجودہ بنک مشترک سرمائے کی کمپنیاں ہیں جن کے مالک ان کے حصہ دار ہوتے ہیں۔ حصہ داروں کو بنک سود نہیں دیتا بلکہ ہر سال اپنی آمدنی کا حساب کر کے منافع کی شکل میں ادائگی کرتا ہے۔ کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ بنک کیوں یہی صورت امانت داروں کے ساتھ اختیار نہیں کر سکتا مثال کے طور پر اگر حصہ دار کا ۱۰۰/- روپیہ سال بھر میں دس یا بارہ فی صدی منافع کماتا ہے تو امانتدار

کے ۱۰۰/- روپیہ کو دس یا بارہ فی صدی کی کوئی کسر کما سکنا چاہیے۔ حصہ دار کا ۱۰۰/- روپیہ مستقلاً بنک کے پاس موجود ہے اور امانت دار کا سو روپیہ شاید صرف ایک سال یا دو سال رہے۔ لیکن ایک سال رہنے والے سو روپے کی کارکردگی کو مستقل رہنے والے سو روپے کی کارکردگی کی کوئی کسر تو ضرور ہونا چاہیے۔ یہ بنک کاروں کا کام ہے کہ وہ اس کسر کو ڈھونڈیں۔ اور روپے کی کارکردگی کی جو کسر معلوم ہو اسی کسر کے مطابق امانت دار کو منافع کی ادائگی کی جائے۔

یہاں تک بنک کاری میں ترمیم کوئی خاص پیچیدگی پیدا نہیں کرتی۔ پیچیدہ مسئلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب ہم بنک سے یہ تقاضا کرتے ہیں کہ وہ قرض لینے والے سے بھی اس کے منافع کا حصہ وصول کرے بہ نسبت معین سود کے۔ سب سے بڑی خدمت جو موجودہ بنک اس سلسلے میں سرانجام دیتے ہیں وہ مال کی کفالت پر مختصر میعاد کے قرضے ہیں۔ جب مال بک جاتا ہے تو قرض ادا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مختصر میعاد کی ہنڈیاں ہیں جنہیں بنک کیش کر دیتا ہے۔ اور مختصر میعاد کا سود ہنڈی کی قیمت سے وضع کر لیتا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس نوعیت کے قرضے بنکوں کے کل قرضے کا کتنا فی صدی ہیں۔ کیونکہ اس قسم کے اعداد و شمار بنک علاحدہ علاحدہ نہیں رکھتے۔ لیکن بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ کاروبار کا یہ حصہ بنک کے کل کاروبار کے نصف سے زیادہ ہوگا۔ اس میں بڑی سہولت سے ایسی ترمیم کی جا سکتی ہے جس سے روپیہ بھی تاجر کو میسر آ جائے اور سود کا اطلاق بھی نہ ہو۔ فرض کیجیے کہ زید کے پاس ایک ہزار روپے کی ہنڈی ہے جس کے خلاف وہ ۳ ماہ کے لیے روپیہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ ناممکن نہیں ہے کہ زید کے پاس کچھ رقم اپنی بھی ہو۔ مثلاً ایک سو روپے اس کے پاس موجود ہوں۔ بنک یہ شرط عائد کر سکتا ہے کہ وہ سو روپے زید بنک کو دیدے اور چونکہ سو روپیہ ایک ہزار روپے کا صرف دسواں حصہ ہی ہے بنک زید کو تین ماہ کے لیے ایک ہزار روپیہ اس صورت میں دے سکتا ہے جب زید اپنا سو روپیہ بنک کو تین ماہ کی دس گنا مدت یعنی ۳۰ ماہ کے لیے دیدے۔ اس طریقے میں کاروبار سودی نوعیت کا نہیں رہتا اور بنک کو بھی روپیہ دینے سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ اسے اس طرح کوئی فائدہ بھی نہیں ہوتا۔ فائدہ پیدا کرنے کی کئی شکلیں اختیار کی جا سکتی ہیں مثلاً بجائے ۳۰ ماہ کے زید کا سو روپیہ ۳۳ ماہ تک بنک کے پاس رہے یا یہ کہ بنک کو جو فالتو کام اس روپے کے لین دین کے سلسلے میں کرنا پڑتا ہے اس کا حق خدمت وہ رقم کی ایک فی صدی کی شکل میں وصول کرے۔

یہی طریقہ قرض کی ان دوسری شکلوں میں بھی اختیار کیا جا سکتا ہے جہاں ہنڈی یا سال کی کفالت موجود نہ ہو بلکہ ایک آدمی کسی تعمیری یا صرفی ضرورت سے قرض لینا چاہتا ہو اور کفالت اس کے پاس وہی ہو جو آج کل کے بنک منظور کرتے ہیں یعنی زیور یا تمسکات۔ اس میں بھی بنک قرض کی ایک کسر کا مطالبہ قرض لینے والے سے کر سکتا ہے اور اگر قرض لینے والا قرض کا دس فی صدی دیدے تو اسے دس گنا قرض اس مدت تک کے لیے مل سکتا ہے جس مدت کے دس گنا تک وہ اپنا روپیہ بنک کے پاس رکھنے کو تیار ہو۔

مدت کو اگر دس گنا کی بجائے گیارہ یا بارہ گنا کر دیں تو بنک کے نفع کی صورت بھی نکل آئے گی۔

حکومت کو جو قرضے ضرورت ہوتے ہیں ان کی صورت ڈھونڈنا بھی کوئی ایسا ناممکن نہیں ہے مثال کے طور پر منگلا ڈیم پر ایک ارب روپیہ خرچ ہوگا اور سات سال اس کی تعمیر پر صرف ہوں گے۔ منگلا ڈیم بن چکنے کے بعد ساڑھے تین لاکھ کلو واٹ بجلی پیدا ہوگی۔ اور تیس لاکھ ایکڑ زمین سیراب ہوگی۔ ظاہر ہے کہ ساڑھے تین لاکھ کلو واٹ بجلی کم و بیش بیس کروڑ روپیہ سالانہ لائے گی اور تیس لاکھ ایکڑ زمین کی سیرابی سے کم و بیش دس کروڑ روپیہ سالانہ آبیانہ کی شکل میں وصول ہوگا۔ موجودہ صورت یہ ہے کہ حکومت تین چار فی صدی سالانہ سود پر یہ رقم حاصل کرتی ہے۔ کیا یہ ناممکن ہے کہ حکومت مثال کے طور پر منافع کے ۳۲ فی صدی پر یہ رقم لوگوں سے مانگے؟ یعنی سات سال بعد جب منگلا ڈیم مکمل ہو جائے اور فرض کر لیجیے کہ اس سے تیس کروڑ روپے سالانہ آمدنی شروع ہو جائے تو حکومت دس کروڑ روپیہ اپنے قرض خواہوں کو منافع کی شکل میں دے سکتی ہے۔ دس کروڑ روپے سے ہر سال سرمائے کا دس فی صدی قرض خواہوں کو لوٹاتی رہے اور باقی دس کروڑ اپنی صرفی ضروریات میں استعمال کرے۔

سرمایہ دار کے نقطۂ نظر سے یہ آمدنی دس فی صدی ہوگی جو موجودہ ۳½ فی صدی سے بہت زیادہ ہے۔ لیکن رکاوٹ یہ ہوگی کہ پہلے چھ سات سال اس رقم پر کوئی منافع حاصل نہ ہوگا۔ اگر کوئی شخص اتنا انتظار نہ کر سکے اور اسے منافع شروع ہونے سے پہلے رقم کی ضرورت پڑ جائے تو وہ اپنے تمسکات اسی طرح سٹاک ایکسچینج میں بیچ سکے گا جس طرح وہ آج کل بیچ سکتا ہے۔

میری مودبانہ گذارش یہ ہے کہ اس نوعیت کے تمام سوال ذرا سا ذہن پر زور ڈالنے سے حل کیے جا سکتے ہیں بشرطیکہ ہم احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوں۔ خدا کا خوف ہمارے دلوں میں زیادہ

نہیں تو اتنا ضرور ہو کہ ہم اس کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے کا تصور بھی نہ کر سکیں۔ تو پھر خدا کے احکام بھی واضح طور پر سمجھ میں آجائیں گے۔ اور ان پر عمل کرنے کی توفیق بھی ہمیں مل سکے گی۔

آخر میں مجھے یہ تجویز پیش کرنے کی اجازت دیجیے کہ شرکائے مذاکرہ کی طرف سے حکومت سے یہ درخواست کی جائے کہ وہ علماء اور ماہرین مالیات اور بنک کاروں کا ایک کمیشن قائم کرے جو حکومت کو بتائے کہ کہاں تک اسلامی احکام کی روشنی میں موجودہ نظام بنک کاری میں ترمیم کی گنجائش ہے۔

مسلم ثقافت ہندوستان میں

مصنفہ مولانا عبدالمجید سالک

مسلمانوں نے ہندوستان پر مدت دراز تک حکومت کی اور ان کے دور حکومت ہی میں ہندوستان کی حقیقی عظمت کی تاریخ بنی۔ برِ کبیر پاک و ہند کو مسلمانوں نے ایک ہزار سال کی مدت میں کن برکات سے آشنا کیا اور اس قدیم ملک کی تہذیب و ثقافت اور زندگی کے مختلف شعبوں پر کتنا وسیع اور گہرا اثر ڈالا۔ یہ اس کتاب میں بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ قیمت بارہ روپے۔

مسئلۂ زمین اور اسلام

مصنفہ شیخ محمود احمد

زرعی مسائل کا صحیح حل پاکستان کی سیاسی اور معاشی زندگی کے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے لیکن اس کے باوجود ان مسائل کو قوم نے نظر انداز کیا ہے یا غلط انداز سے ان پر بحث کی ہے جو گمراہ کن ہے۔ اس بہت بڑے خلا کو پورا کرنے کی یہ ایک سعی بلیغ ہے۔ صفحات ۲۲۴۔ قیمت ۴/۴ روپے۔

ملنے کا پتہ: سیکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور